سلطان ناصر الدین محمود (۱۲۴۶ - ۱۲۶۰) ایک بڑا نیک نفس سلطان تھا جو اہل علم اور اخیار و ابرار کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا[1] اُس کے وزیر اعظم بلبن نے ایک اور مدرسہ اپنے آقا کے نام پر "مدرسہ ناصریہ"[2] کے نام سے قائم کیا۔ منہاج سراج جو "طبقات ناصری" کے مشہور مصنف ہیں اس مدرسہ کے صدر مقرر کیے گئے[3]

بلبن نے پہلے وزیر اعظم کی حیثیت سے اور پھر بادشاہ وقت کی حیثیت سے اہل فضل و کمال کی تربیت و سرپرستی پر توجہ کی۔ اگرچہ وہ اپنی عظمت شاہانہ کے رکھ رکھاؤ میں غیر معمولی التزام ملحوظ رکھتا تھا، پھر بھی اُسے اہل علم کے یہاں جانے میں دریغ نہ ہوتا[4]۔ وہ اکثر انھیں کے ساتھ کھانا کھاتا[5] اُس کے دربار کے درخشاں ترین ستارے امیر حسن اور امیر خسرو تھے۔ برنی نے ان اساتذہ کرام کی ایک طویل فہرست دی ہے جو شہر دہلی کے مختلف مدرسوں میں فرائض درس و تدریس انجام دیتے تھے اور جو اپنے علم و فضل کے لیے شہرہ آفاق تھے[6]۔ علماء کے علاوہ فقہاء، اطباء، منجمین، ریاضی داں اور ماہرین

---

[1] منہاج سراج ناصر الدین محمود کی سیرت کے بارے میں لکھتا ہے:-
"آنچہ حق تعالیٰ از اوصاف اولیاء و اخلاق انبیاء در ذات معظم بادشاہ و پادشاہ زادہ ودیعت نہادہ است ..... از تقویٰ و امانت و زہادت جمع . صحبت علماء و مودت مشائخ و حلم با دیگر معانی گزیدہ ..... باتفاق اہل عصر در ذات ہیچ بادشاہ ..... جمع نبودہ" (طبقات ناصری صفحہ ۲۰)
اسی طرح فرشتہ اس کے بارے میں لکھتا ہے:-
"صلحاء و علماء را دوست داشتے"

[2] عہد رضیہ میں بھی منہاج سراج اسی نام کے ایک مدرسہ کے متولی مقرر کیے گئے تھے چنانچہ جب اس کے زمانہ میں وہ گوالیر سے دہلی پہونچے، تو انہیں مدرسہ ناصریہ کی تولیت تفویض ہوئی۔ [3] "و علمائے آخرت و مشائخ ہمہ را جاہ و ا بغایت حرمت داشتے و بدیدن بزرگان دین در خانہائے ایشاں برفتے و بعد از نماز جمعہ با چندان کوکبہ و دبدبہ کہ بادشاہ رفتے در خانہ مولانا برہان الدین بلخی فرود آمدے و تعظیم و توقیر آں عالم ربانی بجا می آورد ... قاضی شرف الدین ولوالجی و مولانا سراج الدین سجزی و مولانا نجم الدین دمشقی را کہ علمائے آخرت بودند تعظیم داشت بسیار مکرر دیدہ" (تاریخ فیروز شاہی برنی صفحہ ۴۶) [4] غالباً بے حضور علماء [5] بلبن ہمیشہ از علماء در وقت طعام خوردن مسائل دین پرسیدے و در مجلس طعام دانشمنداں و ریشاں او بحث کردندے" (تاریخ فیروز شاہی برنی صفحہ ۴۶)

[6] "در عصر بادشاہی سلطان بلبن چندیں علماء سرآمد کہ از فحول استادان بودند (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

علوم دینیہ بھی تھے[1] جنہیں سلطان بلبن کی سرپرستی حاصل تھی۔ یورش تاتار کے زمانے میں بہت سے علماء و صناع اور فن کار تلاش امن و عافیت میں دہلی چلے آئے تھے۔ ان کے آنے سے دار الملک دہلی کی رونق دوبالا ہوگئی تھی[2] اس عہد کے مشہور اساتذہ میں شمس الدین خوارزمی، برہان الدین بزاز، نجم الدین دمشقی اور کمال الدین زاہد قابل ذکر ہیں۔ شاہزادہ محمد خاں (خان شہید) نے شیخ سعدیؒ سے بھی ہندوستان تشریف لانے کی درخواست کی تھی، مگر شیخ نے پیرانہ سالی کی بنا پر معذرت کرلی[3]

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) بر صدور افادت سبق می گفتند چنانکہ مولانا برہان الدین بلخی، مولانا برہان الدین بزاز و مولانا نجم الدین دمشقی شاگرد مولانا فخر الدین رازی و مولانا سراج الدین سجزی و مولانا شرف الدین ولوالجی و صدر جہاں منہاج الدین جوزجانی و قاضی رفیع الدین گازرونی و قاضی شمس الدین مراغی و قاضی رکن الدین ساماتہ و قاضی جلال الدین کاشانی پسر قاضی قطب الدین کاشانی و قاضی لشکر قاضی سدید الدین و قاضی ظہیر الدین و قاضی جلال الدین و چندان استادان و مفتیان سرآمدگان کہ از شاگردان و پسران علماء عہد شمسی در سبق گفتن و نوشتن جواب فتوی معتبر بودند۔ در مقابلہ عہد بلبنی چندیں استادان و بندگان کہ یکے از ایشان اقلیمے را بیاراستہ و پیراستہ بودندے" (ایضاً صفحہ ۱۱۱-۱۱۲)

[2] و ہمچناں حکماء و اطبا عہد بلبنی نظیر خود در حکمت و طب نداشتند چنانکہ مولانا حمید الدین مطرز کہ ہم در نجوم و ہم در طب بقراط و جالینوس آں عصر بودہ اند۔ و مولانا بدر الدین دمشقی کہ در علم طب نظیر خود نداشت و در تقوی و زہد یگانہ بودہ است و مولانا حسام الدین ماریکلہ و چند طبیبان ماہر آں عصر آراستگی داشت" (ایضاً صفحہ ۱۱۲)

[3] اگرچہ یہ سلسلہ التمش کے عہد ہی سے شروع ہوگیا تھا، چنانچہ منہاج سراج نے اس عہد کی علمی سرگرمیوں کے اسباب میں لکھا ہے:
"ہر کہ از حبائل حوادث بلاد عجم و نکبات کفار بفضل الفضل ایزدی خلاص یافت ملاذ و ملجاء و مہرب و مأمن حضرت جہاں پناہ آں پادشاہ ساخت" طبقات ناصری صفحہ ۱۲۶)
بعد میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ ہلاکو نے ناصر الدین محمود کے زمانہ میں ۶۵۶ھ کے اندر خلافت عباسیہ کو ختم کیا اس کے بعد تاتاریوں کی یورش بڑھ گئی اور مسلم آزادی بڑھ گئی جس کے نتیجہ میں علماء و فضلاء دیگر بزرگان امن و عافیت کی جستجو میں ہندوستان آنا شروع ہوئے اور یہ سلسلہ بلبن کے زمانہ تک برقرار رہا۔ [3] "و مجلس محمد سلطان مذکور (خان شہید) از دانایان و معتبران و فاضلان و ہنرمندان مملو و مشحون بودے و ندیمان او شاہنامہ و دیوان سنائی و دیوان خاقانی و خمسہ شیخ نظامی خواندندے و اشعار بزرگان مذکور را دانایان در پیش او بحث کردندے و امیر خسرو و امیر حسن بخدمت او چاکر بودند پنج سال در ملتان خدمت کردہ اند و جامگی و انعام از آں شاہزادہ یافتہ .... و خان شہید دو بار نامہ کردہ و دو کرت از ملتان بطلب شیخ سعدی قاصداں فرستاد و شیخ سعدی را در شیراز فرستاد و مقام در ملتان طلب کردہ و خواستہ کہ در ملتان خانقاہ سازد و دیہا بر خانقاہ وقف کند۔ خواجہ سعدی از ضعف پیری نتوانست آمد و ہر دو کرت یکان سفینہ غزل بخط خود بخان فرستادہ و عذر نا آمدن خود در رقم آوردہ" (تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی [illegible] [illegible])

ابتدائی تعلیم جو مکاتب میں دی جاتی تھی، صرف مقامی آبادی کی نجی کوششوں پر چھوڑ دی جاتی تھی۔ عباسیوں کے زمانے میں ایران اور وسط ایشیا کے تمام بڑے شہر اپنے تعلیمی اداروں کی شوکت و عظمت کی بنا پر بغداد سے گوئے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ ادارے یا تو شاہی خاندان کے افراد نے قائم کئے تھے، یا عوام کے خیر و خیرات سے۔ انھیں اداروں کے ذریعہ ثقافتی ترقی اور تحقیقات علمیہ کا جذبہ پروان چڑھتا رہا۔

(۲) غزنوی اور غوری عہد حکومت

سلطان محمود نے غزنیں میں ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا اور اس کے اخراجات کے لیے بہت بڑا وقف جاری کیا۔[1] اس مدرسہ میں وسط ایشیا اور ایران سے طلبا رکھنچے چلے آتے تھے۔ محمود کو

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ)

"سامانی خاندان کے عہد حکومت میں بخارا بزرگی کا گہوارہ، ملک کا مرکز، منتخب روزگار لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ، روئے زمین کے ادبا کا مطلع النجوم اور فضلائے دہر کا بازار تھا۔" (یتیمۃ الدہر جلد رابع صفحہ ۳۴)

اسی طرح بشاری مقدسی جو ۳۷۵ھ کے قریب ماوراء النہر پہنچا تھا، سامانیوں کی علم نوازی و علماء پروری کے بارے میں لکھتا ہے:

"سامانی حکمرانوں کا دستور ہے کہ وہ علماء کو زمین بوسی کی تکلیف نہیں دیتے۔ ماہ رمضان کی جمعراتوں میں عشاء کی نماز کے بعد مجالس مناظرہ قائم کرتے ہیں۔ پہلے بادشاہ کوئی مسئلہ دریافت کرتا ہے پھر علماء اس میں بحث کرتے ہیں .... بخارا میں جو شخص سب سے زیادہ فقہ کا عالم ہوتا ہے اُس کو منتخب کر کے اس کا رتبہ بڑھاتے ہیں، اُسی کی رائے پر عمل کرتے ہیں ..... اور اسی کے مشورے سے اعلیٰ عہدوں پر لوگوں کا تقرر کرتے ہیں۔" (احسن التقاسیم صفحہ ۳۳۹)

[1] فرشتہ لکھتا ہے:-

"سلطان چوں بلخ وغیر وزی ازیں سفر مراجعت نمود، فرمود تا در غزنیں مسجد جامع بنیاد نہادند .... و در جوار آں مسجد، مدرسہ بنا نہادہ و بنفائس کتب و غرائب نسخ موشح گردانیدہ، دہات بسیار بر مسجد و مدرسہ وقف فرمود۔" (تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۷)

غالباً فرشتہ کا ماخذ "روضۃ الصفا" ہے جہاں میر خوند نے لکھا ہے کہ جب سلطان قنوج وغیرہ بلاد ہندوستان کی فتح سے فارغ ہو کر غزنی پہونچا تو اُس نے یہ مدرسہ اور کتب خانہ قائم کیا۔

"سلطان چوں از بلاد ہندوستان باز گشت جامع بزرگ در میان غزنیں بنیاد نہاد (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

علم و ادب کی سرپرستی سے بڑی دلچسپی تھی۔[1] اس کے دربار میں البیرونی، فردوسی، دقیقی اور بہت سے دیگر علماء، مفکرین و شعرائے متفلقین جمع رہتے تھے۔ اس کے مدرسہ سے متعلق جو کتب خانہ تھا، وہ اپنی نوعیت میں منفرد تھا۔[2] جملہ علوم و فنون پر کتابوں کا ایک عظیم ذخیرہ اس میں موجود تھا۔ مشہور فلسفی عنصری اس مدرسہ کا صدر تھا۔

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) .... و در جوار آں مسجد و مدرسہ بنیاد نہاد و بنفائس کتب و غرائب نسخ از اموضع و مشحون گردانید و قریٰ و مستغلات بسیار برآں وقف کرد۔" (روضۃ الصفا جلد چہارم صفحہ ۱۸)

بادشاہ وقت کی تقلید میں امراء و اعیان مملکت نے بھی اقطار ملک میں بے شمار مدارس و دیگر بقاع خیر تعمیر کرائے۔ چنانچہ فرشتہ اس کی نسبت لکھتا ہے:

"چوں سلطان محمود را ذوق بہ بنائے مسجد و مدرسہ شد بمقتضائے الناس علیٰ دین ملوکہم ہر یکے از امراء و اعیان دولت بہ بنائے مسجد و مدارس و رباطات و خوانق مبادرت فرمودند۔ در اندک فرصت آں مقدار عمارات عالیہ باتمام رسید کہ از حیز شمار بیروں گشت۔" (تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰)

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [1] ابن الاثیر نے محمود کی علمی سرپرستی کے بارے میں لکھا ہے۔

"وصنف له كثير من الكتب في فنون العلم وقصده العلماء من اقطار البلاد وكان يكرمهم ويقبل عليهم ويعظمهم ويحسن اليهم" (کامل لابن الاثیر المجلد التاسع صفحہ ۱۳۹)

مختلف علوم میں بہت سی کتابیں اس کے نام پر معنون کی گئیں اور اطراف و جوانب سے علماء اس کے دربار میں آئے وہ بھی ان کی عزت کرتا تھا انھیں انعامات سے نوازتا تھا اور ہر طرح ان کے ساتھ احسان کرتا تھا۔

[2] اس کتب خانہ کی تعمیر کے متعلق روضۃ الصفاء اور "تاریخ فرشتہ" کی تصریحات اوپر گزر چکی ہیں۔ بعد میں بھی اس کی ثروت میں اضافہ ہوتا رہا چنانچہ رے کی فتح کے بعد مال غنیمت میں جو کتابیں ہاتھ لگیں، ان میں سے فلسفہ، نجوم اور اعتزال کی کتابیں تو محمود نے جلوا دیں، باقی سو اونٹوں پر لدوا کر غزنی کے کتب خانہ میں بھجوا دیں۔ ابن الاثیر نے اس کا ذکر یوں کیا ہے:

"واحرق كتب الفلسفة ومذاهب الاعتزال والنجوم واخذ من الكتب ما سوى ذلك مائة حمل"

سلطان نے فلسفہ، اعتزال اور نجوم کی کتابیں جلا دیں اور ان کے علاوہ باقی سو اونٹوں کے بوجھ کے برابر کتابیں لے لیں۔

اسی طرح میر خواند نے "روضۃ الصفا" میں لکھا ہے۔

"محمود حکم کرد کتب خانہ بعد الدعلہ کتب بسیار بود آنچہ مشتمل بود بر سخنان حکماء و اہل اعتزال بموجب فرمان سوختہ گشت و باقی را بغزنیں بردند۔"

اس کتب خانہ کی ثروت میں محمود کے بعد بھی اضافہ ہوتا رہا کیونکہ محمود کے جانشین مسعود نے جب [illegible] پر فتح پائی اور مال غنیمت میں شیخ بوعلی سینا کے اثاث البیت کے ساتھ ان کی کتابیں بھی ہاتھ لگیں جو فلسفہ و حکمت پر مشتمل تھیں تو یہ غزنی کے کتب خانہ ہی میں داخل ہو گئیں جہاں وہ [illegible] تک رہیں۔ (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

محمود کے بیٹے مسعود نے بھی باپ کی روایات کو برقرار رکھا اور بڑی فیاضی سے اہل علم

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) اس کے بعد جب علاء الدین جہانسوز نے غزنی کو فتح کر کے آگ لگادی یہ کتب خانہ بھی جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ ابو الحسن بن ابی الفوارس نے "اخبار الدولۃ السلجوقیہ" (صفحہ ۷) میں لکھا ہے۔

ثم سار العمید ابو سهل الحمدونی مع تاش فراش الی اصفهان مع جیوش	پھر عمید لشکر ابو سہل حمدونی تاش فراش کے ہمراہ لشکر جرار لے کر اصفہان کو چلا .....
فانهزم منها الملك علاء الدولة واغارا علی خزائنه وداره وكان شیخ الحكیم ابو علی بن سینا رحمه الله وزیر الملك علاء الدولة فاما عسکر تاش فراش علی بیت کتب ابی علی ونقلوا اکثرة تصانیفه الی خزانة کتب غزنة وكانت فیها مجموعة الی ان احرقها ملك الجبال الحسین بن الحسین ۔	اس لشکر سے علاء الدولہ ابن کاکویہ نے شکست کھائی۔ ابو سہل اور تاش فراش نے اس کے خزانوں اور مکان پر غارتگری کی شیخ بو علی سینا علاء الدولہ کا وزیر تھا۔ لہٰذا تاش فراش کے لشکر نے شیخ بو علی سینا کے کتب خانہ کو بھی لوٹا اور اُس کی بہت سی کتابیں لوٹ کر غزنی کے کتب خانے گئے۔ وہاں وہ جمع رہیں یہاں تک کہ اس کتب خانہ کو غور کے بادشاہ حسین بن الحسین (علاء الدین جہانسوز) نے جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔
(اخبار الدولۃ السلجوقیہ صفحہ ۷)	

اسی طرح ابن الاثیر "ذکر الحرب بین علاء الدولہ وعسکر خراسان" کے زیر عنوان لکھتا ہے:۔

"وكان ابو علی بن سینا فی خدمة علاء الدولة فاخذت کتبه وحملت الی غزنة فجعلت فی خزائن کتبها الی ان احرقها عساکر الحسین بن الحسین الغوری" (کامل ابن اثیر جلد نہم ص)	ابو شیخ بو علی سینا علاء الدولہ ابن کاکویہ کی خدمت میں موجود تھا۔ پس اس کی کتابیں بھی لوٹ لی گئیں اور غزنی لے جائی گئیں جہاں شاہی کتب خانہ میں داخل کر دی گئیں۔ وہ وہاں رہیں تا آنکہ انہیں علاء الدین حسین جہانسوز کے لشکر نے جلا دیا۔

مال غنیمت کے علاوہ ویسے بھی فلسفہ وحکمت کی نادر کتابیں اس کتب خانہ میں داخل کی جاتی تھیں چنانچہ شیخ بو علی سینا کی "الحکمۃ المشرقیہ" (جو اب دنیا سے بالکل ہی ناپید ہو چکی ہے) اور "الحکمۃ العرشیہ" کے واحد نسخے غزنی ہی کے کتب خانہ میں تھے مگر انہیں بھی سنہ ھ میں علاء الدین جہانسوز کے لشکر نے غزنوں کے ساتھ مل کر جلا ڈالا۔ چنانچہ ابو الحسن البیہقی "تتمہ صوان الحکمۃ" کے اندر شیخ بو علی سینا کے تذکرے میں لکھتا ہے۔

"واما الحکمة المشرقیة بتمامها والحکمة العرشیة فقال الامام اسماعیل الباخرزی انهما فی بیوت کتب السلطان مسعود بن محمود بغزنه۔	رہی حکمت مشرقیہ (مکمل) اور حکمت عرشیہ تو امام اسماعیل باخرزی نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ وہ سلطان مسعود بن محمود کے غزنی کے کتب خانہ میں موجود تھیں یہاں تک کہ بادشاہ غور علاء الدین

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کی سرپرستی کی۔ اسی کے عہد حکومت میں البیرونی نے "قانون مسعودی" کو مکمل کیا جو قرون وسطیٰ کی علم الہیئت اور جغرافیہ پر سب سے بیش قیمت تصنیف ہے۔[1]

غزنوی خاندان کے متاخر حکمرانوں نے اپنا پایۂ تخت غزنی سے لاہور میں منتقل کر دیا[2] جو بارھویں

باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ

حتی احرقها ملك الجبال الحسين وعسكر الغور والغز فی شهور سنة ست واربعين وخمس مائة۔ — حسین جہانسوز اور غوریوں اور غزوں کے لشکر نے انھیں ۵۴۶ھ میں جلا دیا۔ (تتمہ صوان الحکمۃ ص...)

حاشیہ صفحہ ہٰذا: [1] ابن الاثیر نے مسعود کی علمی سرپرستی کے بارے میں لکھا ہے:

"کان السلطان مسعود شجاعاً کریماً فضائل کثیرة محباً للعلماء کثیر الاحسان والتقرب لهم صنفوا له التصانیف الکثیرة فی فنون العلوم" (کامل لابن الاثیر المجلد التاسع صفحہ ۱۶۸)

سلطان مسعود بہادر اور سخی تھا بہت سے اوصاف حمیدہ سے متصف تھا۔ علماء سے محبت رکھتا تھا اور ان پر بہت زیادہ احسان کرتا تھا اور اپنے تقرب سے نوازتا تھا۔ انہوں نے مختلف علوم میں بہت سی کتابیں اس کے نام پر معنون کیں۔

اسی طرح "روضۃ الصفا" میں اس کی سیرت کے ضمن میں لکھا ہے۔

"سلطان مسعود پادشاہے شجاع وکریم الاخلاق بود وسخاوت مفرط داشت و با علماء و فضلاء مجالست نمودے و درباره ایشاں انواع احسان و امتنان بتقدیم رسانیدے جمع از افاضل باسم او کتب نوشتہ اند...... و در ممالک محروسہ آں شہریار بقاع خیر از مساجد و مدارس و غیر ذلک بحیثیتے نہاد کہ زبان از تعداد آں قاصر است۔"

"روضۃ الصفا" کے اتباع میں فرشتہ نے بھی لکھا ہے:

"او پادشاہے بود شجاع وکریم الاخلاق، سخاوت بافراط داشت، علماء و فضلاء را مجالست نمودے و درباره ایشاں انواع احسان و انعام مبذول داشتے۔ جمعے کثیر از فضلاء باسم او کتب نوشتند۔ از آنجملہ استاد ابوریحان خوارزمی منجم کہ علامۂ وقت بود و در فن ریاضیات نظیرے نداشت قانون مسعودی در علم ریاضی بنام نامی او نوشت و فیلے از نقرہ صلہ یافت۔ و قاضی ابو محمد ناصحی نیز کتاب مسعودی در فقہ مذہب ابوحنیفہ بنام آں شاہ افاضل پناہ تالیف نمود...... و در اوائل سلطنت او در ممالک محروسہ چنداں مدارس و مساجد بنیاد نہاد کہ زبان بیان از تعداد آں عاجز و قاصر است۔" (تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ...)

حاشیہ صفحہ ہٰذا: [2] غالباً یہ واقعہ آخری غزنوی تاجدار خسرو ملک کے باپ اور پیش رو خسرو شاہ کے عہد حکومت کے اندر ۵۵۵ھ میں پیش آیا کیونکہ بقول منہاج سراج محمد غوری نے غزنی کو ۵۶۹ھ میں غزوں سے چھینا تھا۔

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

صدی ہی میں اسلامی علوم کا ایک اہم مرکز بن گیا۔

غوریوں کی فتوحات کے بعد سیاسی اقتدار کا مرکز لاہور سے دہلی میں منتقل ہوگیا[1] اس طرح تیرھویں صدی کا وسط آتے آتے، دنیائے اسلام کا تمام علمی و ثقافتی سرمایہ ہندوستان میں پہنچ گیا اور دہلی مشرق میں اسلامی علوم کا سب سے بڑا مرکز بن گئی جو تعلیمی نظام غزنی میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ چکا تھا، وہی دہلی میں اختیار کیا گیا اور وہیں سے یہ پورے ملک میں پھیلا۔ حسن نظامی نیشاپوری "تاج المآثر" میں لکھتا ہے کہ سلطان شہاب الدین محمد غوری نے اجمیر میں بہت سے مدرسے قائم کئے[2] جو ہندوستان کے اندر اپنی نوعیت کے اولین ادارے تھے۔

(۲) عہد ممالیک

التتمش جس نے صحیح معنوں میں سلطنت دہلی کو مستحکم کیا[3] حکومتی ذمہ داریوں کے باوجود علماء و

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) "چوں سلطان معزالدین ملک تکینا باد شد، لشکر غز و امرائے آں جماعت از پیش لشکر خطا ہزیمت شدہ بطرف غزنین آمدہ بودند مملکت غزنین مدت دوازدہ سال از دست خسروشاہ ملک بیروں کردہ و در ضبط آوردہ سلطان معزالدین از تکیناباد بطرف غزنین بدوام می تاخت و بر غزنی زد و آں بلاد از مہمت می داد تا در شہور تسع و ستین و خمس مائہ غزنین را سلطان غیاث الدین فتح کرد۔" طبقات ناصری صفحہ ۱۱۵)

اس طرح غزنین غزوں کے قبضہ میں ۵۴۸ھ میں آیا تھا اور یہ خسرو شاہ کا عہد حکومت تھا کیونکہ خسرو شاہ بہرام شاہ کی وفات کے بعد ۵۵۲ھ میں تخت نشین ہوا تھا۔ منہاج سراج نے لکھا ہے :-

"سلطان رکن الدولہ والدین ور بر وایتے تاج الدولہ والدین خسرو شاہ در سنہ اثنتین و خمسین و خمس مائۃ بتخت نشست مدت ملک او ہفت سال بود۔" (طبقات ناصری صفحہ ۲۵)

منہاج سراج نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ خسرو شاہ غزوں کی چیرہ دستی کے بعد لاہور چلا آیا تھا "خسرو شاہ بلوہور ہندوستان آمدہ بود۔" (ایضاً صفحہ ۲۵)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] اگرچہ دہلی کو قطب الدین نے ۵۸۹ھ میں فتح کرلیا تھا اور اپنی گورنری کے زمانہ میں ۵۹۲ھ کے اندر اسے اپنا صدر مقام بنا کر جامع مسجد وغیرہ تعمیر کرائی تھیں لیکن دہلی کو قبۃ الاسلام بننے کے لیے التتمش کے عہد کا انتظار تھا۔

[2] "واگرچہ شہر و نواحی از حسن بانواع لطف ازہار زینتے بے نہایت داشت... بنور حضور شہریاری آراستہ تر گشت و از یمن وصول پادشاہی رونق و طراوت زیادت یافت و تباشیر صبح نجح از افق مراد پیدا آمدہ و قواعد بتکدہا نقص و خرابی پذیرفت و معابد اصنام و اوثان بمساجد و مدارس بدل افتاد و احکام اسلام و رسوم شریعت شائع و مستمر شد۔" (تاج المآثر قلمی)

[3] التتمش ۶۰۷ھ میں قطب الدین ایبک اور اس کے جانشین آرام شاہ کی وفات پر تخت نشین ہوا۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

مشائخ کی سرپرستی اور ہمت افزائی کے لیے بھی وقت نکال لیتا تھا۔[1] قطب مینار کی تعمیر کا شرف اُسی کو پہونچتا ہے، جس کی سنگین شوکت اور خوش نما حسن تعمیر کی دنیا میں نظیر نہیں ہے اور آج بھی وہ اُس کے عظیم عالی حوصلہ مقصد کی یادگار ہے۔ وہ پہلا شخص ہے، جس نے دہلی میں مدرسہ تعمیر کیا۔ اس کا نام اُس نے سلطان شہاب الدین محمد غوری کے نام پر "مدرسہ معزی" رکھا تھا، کیونکہ محمد غوری کا حقیقی نام معز الدین محمد غوری تھا۔ اسی نام کا ایک اور مدرسہ بدایوں کے اندر، جو شمالی ہندوستان میں اسلامی ثقافت کا ایک اور مرکز بن گیا تھا، قائم کیا گیا۔

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) وہ پہلا تاجدار ہے جس نے دہلی کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ مگر شروع میں اُس کی حالت بڑی ڈانواں ڈول تھی پہلے تاج الدین یلدوز سے ملکی اقتدار کے لیے کشمکش رہی۔ یلدوز کے قضیے سے فارغ ہونے کے بعد ناصر الدین قباچہ سے سندھ و ملتان کے لیے آویزش شروع ہو گئی جس میں بالآخر التمش ہی کو کامیابی ہوئی۔ اس کے بعد اُس نے دہلی کی تزئین و آرائش میں کوشش کی۔ عصامی نے "فتوح السلاطین" کے اندر قباچہ کے قتل کے بعد کی تفصیل کے بعد دہلی کی تزئین و آرائش کا حال لکھا ہے

بدہلی چناں تخت گاہے بساخت　　سپاہش در اقصائے آں ملک تاخت
دہاں شہر یک رونقے شد پدید　　بلے لذتے باشد اندر جدید
بسے سیدان صحیح النسب　　رسیدند در وے ز ملک عرب
بسے کاسبان خراساں زمیں　　بسے نقشبندان اقلیم چیں
بسے عالمان بخارا نژاد　　بسے زاہد و عابد از ہر بلاد
ز ہر ملک ہر جنس خلعت گراں　　ز ہر شہر ہر اصل سیمیں براں
بسے ناقدان جواہر شناس　　جواہر فروشاں بروں از قیاس
حکیمان یونان طبیبان روم　　بسے اہل دانش ز ہر مرز و بوم
درآں شہر فرخندہ جمع آمدند　　چو پروانہ بر نور شمع آمدند
یکے کعبۂ ہفت اقلیم شد　　دیارش ہمہ دار اسلیم شد

[1] منہاج سراج التمش کی علمی سرپرستی کے بارے میں لکھتا ہے:-

از اول عہد دولت و طلوع مملکت در استجماع علمائے باتام و سادات کرام و ملوک و امرا و صدور و کبرا زیادت از ہزار لک بذل فرمود و خلائق اطراف گیتی را بحضرت دہلی کہ دار الملک ہندوستان است و مرکز دائرۂ اسلام و محیط اوامر و نواہی شریعت و حوزۂ دین محمدی و بیضۂ ملت احمدی و قبۂ الاسلام مشارق گیتی صانہا اللہ من الآفات و العاہات جمع آورد۔ و ایں شہر بکثرت انعامات و شمول کرامات آں پادشاہ دیندار مجمع اہل آفاق گشت۔۔۔ غالب ظن آنست کہ ہرگز پادشاہے بحسن اعتقاد و آب دیدہ و تعظیم علما و مشائخ مثل او از مادر خلقت در قماط سلطنت نیامدہ۔

طبقات ناصری صفحہ ۱۷۶ - ۱۷۷

سلطان ناصر الدین محمود (۱۲۴۶ء۔۱۲۶۶ء) ایک نہایت نیک نفس سلطان تھا جو اہل علم اور اخیار و ابرار کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا۔[1] اُس کے وزیر اعظم بلبن نے ایک اور مدرسہ اپنے آقا کے نام پر "مدرسہ ناصریہ" کے نام سے قائم کیا۔ منہاج سراج جو "طبقات ناصری" کے مشہور مصنف ہیں، اس مدرسہ کے صدر مقرر کیے گئے۔[2]

بلبن نے پہلے وزیر اعظم کی حیثیت سے اور پھر بادشاہ وقت کی حیثیت سے اہل فضل و کمال کی تربیت و سرپرستی پر توجہ کی۔ اگرچہ وہ اپنی عظمت شاہانہ کے رکھ رکھاؤ میں غیر معمولی التزام ملحوظ رکھتا تھا، پھر بھی اُسے اہل علم کے یہاں جانے میں دریغ نہ ہوتا۔[3] وہ اکثر انھیں کے ساتھ کھانا کھاتا۔[4] اُس کے دربار کے درخشاں ترین ستارے امیر حسن اور امیر خسرو تھے۔ برنی نے ان اساتذہ کرام کی ایک طویل فہرست دی ہے جو شہر دہلی کے مختلف مدرسوں میں فرائض درس و تدریس انجام دیتے تھے اور جو اپنے علم و فضل کے لیے شہرہ آفاق تھے۔[5] علماء کے علاوہ فقہاء، اطباء، منجمین، ریاضی دان اور ماہرین

---

[1] منہاج سراج ناصر الدین محمود کی سیرت کے بارے میں لکھتا ہے:۔
"آنچہ حق تعالیٰ از اوصاف اولیاء و اخلاق انبیاء در ذات معظم پادشاہ و پادشاہ زادہ ودیعت نہادہ است ...... از تقوی و امانت و زہادت بہ ... . جہت علماء علم و مونت مشائخ دعلم با دیگر معانی گزیدہ ..... باتفاق اہل عصر در ذات ہیچ پادشاہ ..... جمع نبودہ۔" (طبقات ناصری صفحہ ۲۰)
اسی طرح فرشتہ اُس کے بارے میں لکھتا ہے:۔
"صلحاء و علماء را دوست داشتے"

[2] عہد رضیہ میں بھی منہاج سراج اسی نام کے ایک مدرسہ کے متولی مقرر کیے گئے تھے چنانچہ جب اس کے زمانہ میں وہ گوالیر سے دہلی پہونچے، تو انہیں مدرسہ ناصریہ کی تولیت تفویض ہوئی۔ [3] "و علماء آخرت و مشائخ بحر جادہ را بغایت حرمت داشتے و بہ خانہائے بزرگان دین در خانہائے ایشاں برفتے و بعد از نماز جمعہ با چند تن کو کہ ود وید۔ کہ او سوار شدے در خانہ مولانا برہان الدین بلخی فرو آمدے تعظیم و توقیر آں عالم ربانی بجای آوردے و قاضی شرف الدین ولوالجی و مولانا سراج الدین سجزی و مولانا نجم الدین دمشقی را کہ علماء آخرت بودند تعظیم داشت بسیار کردے۔" (تاریخ فیروز شاہی برنی صفحہ ۴۶) [4] "و در بیشتر حضور علماء ... بعضا منبر و صدور از علماء در وقت طعام خوردن مسائل دینی پرسیدے و در مجلس طعام دانشمندان در آں بحث کردندے۔" (تاریخ فیروز شاہی برنی صفحہ ۴۶)

[5] "و ہم در عصر پادشاہی سلطان بلبن چندیں علماء سرآمد کہ از فحول استادان بودند" (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

علوم دینیہ بھی تھے[1] جنہیں سلطان بلبن کی سرپرستی حاصل تھی۔ یورش تاتار کے زمانے میں بہت علماء وصناع اور فن کار تلاش امن وعافیت میں دہلی چلے آگئے تھے۔ ان کے آنے سے دار الملک کی رونق دوبالا ہوگئی تھی[2]۔ اس عہد کے مشہور اساتذہ میں شمس الدین خوارزمی، برہان الدین بزاز، نجم الدین دمشقی اور کمال الدین زاہد قابل ذکر ہیں۔ شاہزادہ محمد خان (خان شہید) نے شیخ سعدیؒ سے بھی ہند تشریف لانے کی درخواست کی تھی، مگر شیخ نے پیرانہ سالی کی بنا پر معذرت کرلی[3]۔

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) بہ صدر افادت سبق می گفتند چنانکہ مولانا برہان الدین بلخی، مولانا برہان الدین بزاز و مولانا نجم الدین دمشقی شاگرد مولانا فخر الدین رازی و مولانا سراج الدین سجزی و مولانا شرف الدین ولوالجی و صدر جہان منہاج الدین و قاضی رفیع الدین گازرونی و قاضی شمس الدین بہرایچ و قاضی رکن الدین سامانہ و قاضی جلال الدین کاشانی پسر قطب الدین کاشانی و قاضی لشکر قاضی سدید الدین و قاضی ظہیر الدین و قاضی جلال الدین و چندان استادان و مفسر آمدگان کہ از شاگردان و پسران علمائے عہد شمسی در سبق گفتن و نوشتن جواب فتویٰ معتبر بودند۔ در عہد بلبن چندیں استادان و بندگان کہ یکے از ایشان اقلیمے را بیارائد پیراستہ بودند" (ایضاً صفحہ ۱۱۱-۱۱۲)

[1] "و چندان حکماء و اطباء عہد بلبنی نظیر خود در حکمت و طب نداشتند چنانکہ مولانا حمید الدین مطرز کہ ہم در نجوم و ہم در بقراط و جالینوس آں عصر بودہ اند، و مولانا بدر الدین دمشقی کہ در علم طب نظیر خود نداشت و در تقویٰ و زہد یگانہ بود و مولانا حسام الدین ماریکلہ و چند طبیبان ماہر آں عصر آراستگی داشت" (ایضاً صفحہ ۱۱۲)

[2] اگرچہ یہ سلسلہ التمش کے عہد ہی سے شروع ہو گیا تھا، چنانچہ منہاج سراج نے اس عہد کی علمی سرگرمیوں کے اسباب میں کہا ہے "چنانکہ از حبائل حوادث بلاد عجم و نکبات کفار فضل الفضلا، یزدی خلاص یافتہ علماء و حکما و عجب و ماوراء حضرت جہاں پناہ آں پادشاہ ساخت" طبقات ناصری صفحہ ۱۲۶)

بعد میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ ہلاکو نے ناصر الدین محمود کے زمانہ میں ۶۵۶ھ میں خلافت عباسیہ کو ختم کیا، بعد تاتاریوں کی چیرہ دستی اور ظلم آزاری بڑھ گئی، جس کے نتیجہ میں علماء و فضلاء و دیگر بندگان امن و عافیت جو کی معیت ہندوستان آ نا شروع ہوئے اور یہ سلسلہ بلبن کے زمانہ تک برقرار رہا۔

[3] "و مجلس محمد سلطان مذکور (خان شہید) از معتبران و فاضلان و ہنرمندان مملو و مشحون بودے، ندیمان او شاہنامہ و دیوان سنائی و دیوان خاقانی و خمسۂ شیخ خواندندے و اشعار بزرگان مذکور و دانایان در پیش او بحث کردندے و امیر خسرو و امیر حسن بخدمت او چاکر بودند و سال ہا در ملتان خدمت کردہ اند و جہان مدار آں شاہزادہ مواجب و انعام یافتہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ و خان شہید از روئے تحفہ نگاہ داشت دو کرت از ملتان در طلب شیخ سعدی قاصد با خرجی راہ بشیراز فرستاد و در ملتان طلب کردہ خواست و در ملتان خانقاہ سازد و دیہات خانقاہ وقف کند۔ خواجہ سعدی از ضعف پیری آمد و ہر دو کرت بیک سفینہ غزل بخط خود بخان فرستاد و عذر نیامدن خود در قلم آوردہ" (تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۶۸-۶۷)

[illegible]

غذا میں حلال و حرام کی تمیز نہیں رہ گئی تھی پستی کا یہ عالم تھا کہ زمین کے کیڑے مکوڑے، حتی کہ چھپکلی تک کھا جاتے تھے۔ خون جماتے اور قاشیں کاٹ کر کھاتے تھے۔ مردہ جانور کھانا عام بات تھی۔ گردن مروڑ کر، ڈنڈے مار کر جانوروں کو کھا جایا کرتے تھے۔ درندوں کے مارے ہوئے شکار کے کھانے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ بے رحمی کا یہ عالم تھا کہ زندہ اونٹ اور دنبے کے کوہان اور چکیاں کاٹ کر کباب بناتے تھے۔ جانوروں کو درخت سے باندھ کر ان پر تیر اندازی کی مشق کرتے تھے سزا دینے میں شقاوت کا یہ عالم تھا کہ عورتوں کو گھوڑے کی دم سے باندھ کر گھوڑے کو سرپٹ دوڑا دیتے تھے یہاں تک کہ ان کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے تھے۔ آدمی کو کوٹھری میں بند کر کے اس کا کھانا پانی بند کر دیتے تھے یہاں تک کہ وہ بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا۔ اس طریقہ کا نام انہوں نے صبر رکھ چھوڑا تھا۔ بے شرمی کی یہ کیفیت تھی کہ حج کے لاکھوں کے مجمع میں مرد اور عورتیں کعبہ کا ننگے طواف کرتے تھے نہاتے وقت اوٹ نہیں کرتے تھے مردوں کی ٹولیاں میدان میں سر عکھول کر یکجا غسل کرتی تھیں۔ پاخانہ پیشاب کے وقت پردہ نہیں کرتے تھے۔ جلسوں میں بیٹھتے تو بیویوں سے ہم صحبتی کے واقعات بیان کرتے[1] حج میں ننگے ساتھ نہانے کو معیوب نہیں سمجھتے تھے[2]

۵:۴ معیشت اور اخلاق | عربوں میں بعض برائیاں افلاس اور معاشی بدحالی کا نتیجہ تھیں۔ غارت گری اور چوری کا ذکر کیا جا چکا ہے معاشی دشواریوں کی وجہ سے قبائل کے درمیان جو معاہدے تجارتی قافلوں اور مویشیوں کے گلوں پر دست اندازی سے باز رہنے کے لیے کیے جاتے تھے وہ زیادہ دن تک باقی رہتے تھے۔

لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کا بہت بڑا محرک معاشی افلاس تھا جس کا ذکر قرآن مجید میں دو مقامات پر آیا ہے۔

لَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُم مِّنْ اِمْلَاقٍ[3] اپنے بچوں کو افلاس کی وجہ سے قتل نہ کرو

---

[1] سیرت النبی ص ۴: ۱۹۱-۱۹۰ [2] بلوغ الارب ۲: ۳۲۱ [3] سورۃ الانعام: ۱۵۱

معاشی وجوہ کی بنا پر لڑکیوں کی پیدائش سے کسی کو خوشی نہیں ہوتی تھی۔ عورتوں کی عام پست حالی اور ان کے ساتھ مختلف زیادتیوں کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عورتیں معاشی طور پر کم تر مفید تھیں۔

عربی لڑائیوں اور جنگوں کے اسباب میں معاشی عوامل کو بڑا دخل تھا۔ عربوں کے طبعی ماحول پر ایک اچٹتی ہوئی نظر بھی انسان کو اس بات پر مطمئن کر دینے کے لیے کافی ہے لیکن معاشی عوامل کی اہمیت کو معقول حد میں رکھنا چاہیئے اور دوسرے نفسیاتی اور اجتماعی عوامل کی اہمیت بھی ملحوظ رکھنی چاہیئے۔ نفسیاتی اور تمدنی عوامل کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے۔ دوسرے عوامل کا ذکر آئندہ آرہا ہے۔

(۵،۵) اجتماعی و سیاسی نظام اور اخلاق | عربوں کے اخلاقی اور اجتماعی مفاسد کا بہت بڑا سبب ان کے یہاں مضبوط اور مستحکم سیاسی نظام کا فقدان تھا اگرچہ ہر قبیلہ کا ایک رئیس ہوتا تھا جو قبیلہ کی نقل و حرکت، سفر و قیام کا مالک ہوتا، نکاح و طلاق، پانی اور چارہ سے متعلق مقدمات کا فیصلہ کرتا تھا، صلح و دیت کے معاملات طے کرتا تھا لیکن وہ قبیلہ کے اندر امن و امان قائم کرنے، شر پسندوں کو ظلم و زیادتی سے باز رکھنے، مجرموں کو سزائیں دینے اور مظلوموں کو ان کا حق دلانے، قاتل سے انتقام لینے، یا دیت دلانے میں بالکل ناکام تھا۔ چند غیر معمولی قوت اور شوکت کے مالک رؤسا کے علاوہ عام طور پر رؤسا قبائل اپنے فیصلوں کو نافذ کرنے کی قوت نہیں رکھتے تھے۔ رئیس قبیلہ کی حیثیت ایک جماعتی قائد کی ہوتی تھی، نہ کہ سیاسی حکمران کی۔ اس کی بے بسی کا یہ عالم تھا کہ وہ خود اپنے مویشیوں، کھیتوں اور چراگاہوں کی حفاظت سے قاصر تھا اگر اس کے خاندان کا کوئی فرد قتل کر دیا جاتا تو قاتل سے انتقام لینا اس کے لیے اتنا ہی دشوار تھا جتنا کہ عام افراد قبیلہ کے لیے۔ قبیلہ کی تنظیم دراصل ایک کمزور قسم کی وفاقی تنظیم تھی جس کی قوت کسی ایک رئیس کے اندر مرکوز نہیں ہوتی تھی بلکہ مختلف خاندانوں کے سربراہوں میں بٹی ہوئی تھی[1] اور ان سربراہوں میں انفرادی مسابقت، رشک و حسد کے جذبات ہمیشہ کارفرما تھے۔ آئے دن ان میں مادی مفادات، محدود خاندانی مقاصد اور عزت و وجاہت کے غلط تصورات کے لیے لڑائیاں ہوا کرتی تھیں۔

قبیلہ کا شیرازہ جن وجوہ سے منتشر نہیں ہوتا تھا وہ کچھ خارجی اسباب تھے، ہر قبیلہ دوسرے

---

[1] التاریخ الاسلامی العام، الدکتور علی ابراہیم حسن، قاہرہ ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۷۹، ۱۸۰۔

قبیلہ سے برسرِ پیکار رہتا تھا۔ قبائل کے درمیان عام تعلق صلح و آشتی کا نہیں لڑائی اور جنگ، قتل اور غارت گری کا تھا۔ کوئی قبیلہ کسی دوسرے قبیلہ کی تاخت سے مامون نہیں تھا۔ ہمیشہ خطرہ لگا رہتا تھا۔[1] یہی خارجی خطرات قبیلہ کی وحدت و سالمیت کو باقی رکھے ہوئے تھے۔ قبیلہ کی عصبیت اور قوت کے جو داخلی عوامل تھے ان سے قبیلہ میں نہ امن و سکون باقی رہ سکتا تھا اور نہ عدل و انصاف قائم ہو سکتا تھا۔

اگرچہ قبیلہ کی عصبیت اور اتحاد کی قوت داخلی ظلم و زیادتی کا سدِباب نہیں کر سکتی تھی لیکن دوسرے قبائل کے حملوں اور مظالم سے افرادِ قبیلہ کو محفوظ رکھنے میں بڑی حد تک کامیاب تھی۔ ہر قبیلہ اپنے افراد کی جان و مال، عزت و آبرو کا محافظ تھا۔ ہر قبیلہ کی پکار پر لبیک کہنا، لڑائی میں اس کا ساتھ دینا، فدیہ دے کر اس کو قید سے رہا کرنا، اس کی طرف سے دیت ادا کرنا، اس کے مستجیر کا احترام کرنا ہر فرد[2] قبیلہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔

ہر فرد دوسرے فرد کی عزت کو اپنی عزت اور اس کی ذلت کو اپنی ذلت خیال کرتا تھا۔ افرادِ قبیلہ میں اخوت اور مروت کے یہی معنی تھے۔ چونکہ اس اخوت کی بنیاد کسی مثبت تصور پر نہیں رکھی گئی تھی بلکہ خارجی خطرہ کے منفی تصور پر قائم تھی، اس لیے یہ اخوت قبیلہ کے افراد کے درمیان باہمی دست درازی اور ظلم و زیادتی کو روک نہیں سکتی تھی۔ اور ان میں عدل و انصاف قائم نہیں کر سکتی تھی۔ قبیلہ صرف خارجی دشمنی کے مقابلہ میں بنیان مرصوص بن سکتا تھا لیکن داخلی دشمنی کے مقابلہ میں ریت کی دیوار کی طرح کمزور تھا۔

قبیلہ کی عصبیت بین القبائلی عدل و انصاف کی راہ میں حائل تھی۔ اس جاہلی عصبیت کا تقاضہ تھا کہ ہم قبیلہ کی ہر حال میں حمایت اور تائید کی جائے خواہ وہ حق پر ہو یا نہ ہو۔ یہ سوال ہی افرادِ قبیلہ کے لیے غیر ضروری تھا۔ ان کے لیے قبیلہ کا ہر صورت میں ساتھ دینا لازمی تھا۔ ایسے معاملات میں ان کا ضمیر خاموش ان کی قوتِ فیصلہ معطل ہو جاتی تھی[3] عربوں میں ملکی پیمانہ پر عدل و انصاف اور حقوقِ انسانی کا تصور

---

[1] درید بن الصمۃ کا شعر ہے:

وھل انا الا من غزیۃ ان غوت غویت وان ترشد غزیۃ ارشد

(ترجمہ) میں تنہا کچھ نہیں، غزیہ کا ایک فرد ہوں، اگر قبیلہ غزیہ گمراہ ہوتا ہے تو میں بھی گمراہ ہوں گا اور اگر وہ حق پر قائم رہتا ہے تو میں بھی حق پر چلوں گا۔ (حماسہ ابو تمام ۱؍۳۰۴) (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اسی عصبیت کی وجہ سے نہیں ابھرا۔

عربی معاشرت اگرچہ مساوات کے اصول پر قائم تھی لیکن یہ اصول ایک طرف بلند نظریہ حیات اور دوسری طرف نظام حکومت دونوں سے محروم ہونے کی وجہ سے مختلف طریقوں سے متاثر اور محدود ہوتا جارہا تھا۔ عربوں میں حسب ونسب کا امتیاز شریف ووضیع کا فرق عام تھا۔ یہ فرق وامتیاز ایک ہی قبیلے کے دو خاندانوں اور دو قبیلوں کے درمیان بھی تھا۔ جو قبائل شریف مانے جاتے تھے ان کا ایک آدمی دوسرے قبیلہ کے دو آدمیوں کے برابر تھا۔ اگر ان کا ایک آدمی قتل ہوتا تو انتقام میں دو آدمیوں کو قتل کیا جاتا تھا یا اس کی دوگنی دیت لی جاتی تھی۔ یہ امتیاز اور فرق مراتب اس حد تک پہونچ گیا تھا کہ جب غزوہ بدر میں قریش کی فوج میں سے عتبہ اور شیبہ میدان میں آئے اور مبارز طلب ہوئے اور انصار ان کے مقابلہ کے لیے نکلے تو عتبہ نے اس بنا پر ان کے مقابلے سے انکار کردیا کہ قریش اور انصار کا جوڑ نہیں ہے۔[۱]

رؤسا قبائل عام افراد کے مقابلہ میں مخصوص امتیازات وحقوق کے مالک تھے۔ مال غنیمت کا چوتھائی حصہ ان کا حق تھا۔ اس کے علاوہ جو عورت یا جو چیز مال غنیمت میں سے ان کو پسند آتی اسے اپنے لیے چھانٹ لیتے تھے۔ انہیں امتیازات نے عربوں میں خاندانی ریاست اور ملوکیت کی راہ ہموار کردی تھی۔ چنانچہ جب کوئی رئیس قوت، دولت حسب ونسب اور ذاتی شرف وعزت میں یک گونہ ممتاز ہوا تو قبیلہ پر اپنی بادشاہت قائم کرلیتا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا لڑکا عربوں کی جمہوری روایات کے علی الرغم قبیلہ کا رئیس اور حکمراں بن جاتا تھا۔

عورت جاہلی معاشرہ میں حقیر اور مظلوم تھی جس کے گھر لڑکی پیدا ہوتی وہ ساتھیوں سے آنکھیں ملاتے

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) اسی مفہوم میں حطیئہ کے اشعار ہیں:۔

استقلامی آل بہتۃ حلتتی | الا اننی وان کنت اینما
الا اتقی منہم دجی عن عرضہم | کذی الانف یحمی انفہ ان یکثما

(شعراء النصرانیۃ ج ۱۸۹ وصفحہ ۲۰۷)

[۱] سیرت النبی ج ۱: ۲۲۷ بادشاہوں کی دیت ۱۰۰ اونٹ تھے جبکہ عام انسان کی دیت ۱۰۰ اونٹ تھے۔ بلوغ الارب ۲/۱۲۲

فرماتا۔ یا باپ بیٹی کی ولادت سن کر گھر پر آنا پسند نہیں کرتا تھا۔ عورتوں کو منحوس سمجھا جاتا تھا۔ بالخصوص سانولی عورتیں یا وہ جن کی جلد پر یا آنکھوں پر سفید داغ ہوں بے حد مبغوض تھیں ان کو شروع ہی میں دفن کر دیا جاتا تھا تاکہ نحوست گھر سے دور ہو۔[1]

آئے دن کی لڑائیوں، جنگوں اور غارت گریوں کے سبب عورتوں کی عفت محفوظ نہ تھی۔ وہ خود اپنی مدافعت سے قاصر تھیں، ان کی عزت و آبرو کی حفاظت بہت کٹھن مسئلہ تھا، حرص و آز کی نگاہیں ان پر لگی رہتی تھیں۔ راتوں میں چھاپہ مار کر عورتوں کو گھروں اور خیموں سے اٹھا لیا جاتا تھا۔ جنگوں میں ان کی پوری جماعت قیدی بنائی جاتی تھی، ان میں بیاہی اور بن بیاہی دونوں طرح کی عورتیں ہوتی تھیں ان سے زبردستی نکاح کر لیا جاتا تھا۔ یا انہیں لونڈیوں کی زندگی گذارنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ گو فدیہ لے کر آزاد کی بھی جاتیں تو اس وقت جبکہ ان کی عصمتیں برباد ہو چکی ہوتیں، بسا اوقات میدان جنگ ہی میں فاتحین کے ہاتھوں ان کی عزتیں لٹتی تھیں۔

عورتوں کی معاشرتی پست حالی کی دوسری وجہ عربوں کے متضاد اجتماعی تصورات و عوامل تھے۔ ایک طرف صحرائی زندگی کی آزادی، جنسی تحریک کی فضا، عشق و محبت کے مواقع، شراب نوشی اور رقص و سرود کا عام رواج، لونڈیوں اور غلاموں کی کثرت، دوسری طرف نسب و حسب کا امتیاز، شریف و وضیع کا فرق، اور کفو کا اہتمام۔[2] عرب نہ پہلے عوامل پر قابو رکھتے تھے اور نہ دوسرے تصورات کی اصلاح کرنے کے لیے تیار تھے۔

عربی زندگی میں عزت کا مقام اس کو نہیں مل سکتا تھا جو کمزور ہو۔ اپنی مدافعت آپ نہ کر سکتا ہو۔

---

[1] الحوفی، المرأۃ فی الشعر الجاہلی، ۲۹۷ [2] الحوفی: المرأۃ فی الشعر الجاہلی، ۲۹۵ قیس بن عاصم کا واقعہ ہے کہ جب ان کا وفد رسول اللہؐ کی خدمت میں آیا تو انہوں نے کہا کہ میرے ہاں جو لڑکی پیدا ہوتی تھی اس کو زندہ درگور کر دیتا تھا تاکہ فضیحت اور بدنامی کا موقع نہ آئے۔ رسول اللہؐ نے حکم دیا کہ ہر ایک لڑکی کے عوض ایک غلام آزاد کرو۔ حضرت ابوبکرؓ نے قیس سے پوچھا کہ تم عرب کے مالدار لوگوں میں ہو تم نے دختر کشی کیوں اختیار کی۔ قیس نے کہا میں ڈرتا تھا کہ میری لڑکیاں تم جیسے (چھوٹے) لوگوں کے ساتھ نکاح کر لیں۔ رسول اللہؐ قیس کی اس بات پر مسکرا کر رہ گئے۔ اور حضرت ابوبکرؓ سے خطاب کر کے فرمایا قیس سادات بادیہ میں سے ہے (محاضرات الادبا ر ۲: ۵۷)

اور اپنی قوت بازو سے اپنے حقوق حاصل نہ کر سکتا ہو۔ عورت کو میراث میں اس لیے حصہ نہیں ملتا تھا کہ وہ تلوار نہیں اٹھا سکتی تھی۔ اور اسی اصول پر کم سن بچوں کو بھی میراث سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ بعض شوہر کے مرنے کے بعد عورت لڑکوں کی میراث میں آجاتی تھی۔ وہ چاہتے تو اس سے شادی کر لیتے۔ یا بیوہ کی زندگی گزارنے پر مجبور کرتے تھے۔ اگر بدقسمتی سے عورت بدصورت ہو تو وہ سسرال میں تاعمر بیوہ رہنے پر مجبور ہوتی تھی۔ طلاق پر کوئی پابندی نہ تھی۔ بار بار طلاق دے کر رجوع کر لیا جاتا تھا اور مذاق کا بہانہ بنا کر عورتوں کو ستایا جاتا تھا۔ مطلقہ عورتوں کو عدت گزر جانے کے بعد بھی شادی کی اجازت بعض اوقات نہیں ملتی تھی، بالخصوص رؤسا اپنی مطلقہ کی دوسری شادی میں اپنی بے عزتی محسوس کرتے تھے[1]

بیویوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہ تھی، اس مرض میں مشرکین، یہود اور نصاریٰ بھی مبتلا تھے۔ بیویوں کے درمیان عدل ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مہر بالعموم عورت کا حق ہوتا تھا لیکن اکثر مہر کا ایک حصہ باپ، بھائی یا ولی کے تصرف میں آتا تھا۔ اس کو حلوان کہتے تھے۔ عورت کو مہر سے محروم کرنے کی ایک صورت یہ تھی کہ ایک مرد اپنی بیٹی یا بہن کو دوسرے کے نکاح میں اس شرط پر دے دیتا تھا کہ دوسرا اس کے عوض اپنی بہن یا بیٹی اس کے ساتھ بیاہ دے[2]

جو عورتیں جنگوں میں قید ہوتیں یا لوٹ میں ہاتھ آتیں ان سے بغیر نکاح کے تعلق جائز سمجھا جاتا تھا۔ ان کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ اور وراثت میں دوسرے اموال کی طرح وہ بھی منتقل ہوتی تھیں۔ ان سے گھروں میں ہر طرح کی خدمت لی جاتی تھی اور ان کے ساتھ عام لونڈیوں اور غلاموں کی طرح سلوک کیا جاتا تھا۔ جنگ میں عورتوں کی طرح مردوں کو بھی قید کر کے غلام بنا لیا جاتا تھا۔ اور ان سے عام غلاموں کی طرح خدمت لی جاتی تھی۔ ان کی بیع و شرا ہوتی تھی۔ وہ وراثت میں منتقل ہوتے تھے۔ غلاموں اور لونڈیوں میں خاصی تعداد رومی، ایرانی، مصری اور حبشی تھی۔ ان میں عربی اور غیر عربی کا تناسب متعین کرنا مشکل ہے لیکن یہ بات کم و بیش یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ عرب غلام اور لونڈیاں کثیر تعداد میں

---

[1] سیرت النبی ۴/۱، ۲۹۵ [2] بلوغ الارب ۲/ ۵۱۲ [3] الحوفی، المرأۃ فی الشعر الجاہلی، ۱۹۰۔ ۱۹۱۔

تھیں، جنگ، غارت گری، رہزنی، اور خرید و فروخت کے طریقوں سے عرب مردوں بالخصوص عرب عورتوں کو ان کی آزادی سے محروم کیا جاتا تھا۔

غلام اور لونڈیاں انسانی حقوق کی حقدار نہ تھیں۔ عربوں کا ضمیر انہیں انسان تسلیم کرنے کا روادار نہ تھا۔ ان کے آقا ان کی جان، مال، عزت و آبرو کے مالک تھے۔ ان کی پوری زندگی انہیں کے رحم و کرم پر تھی۔ وہ جس طرح چاہتے انہیں رکھتے اور جب چاہتے انہیں بیچ دیتے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر شدید سزائیں دینا معمولی بات تھی۔ صرف انہیں لونڈیوں کے ساتھ کچھ بہتر سلوک ہوتا جو حسین و جمیل تھیں، رقص و سرود میں ماہر تھیں یا کسی اور خصوصیت کی حامل تھیں۔ اسی طرح ان غلاموں کی زندگی بھی نسبتاً بہتر تھی جو کسی فن میں مہارت رکھتے تھے یا کسی اور خوبی کے مالک تھے۔[1]

(۱۰۵) دین اور اخلاق | عربوں کا دین انہیں برائیوں سے روکنے، بھلائیوں پر آمادہ کرنے، نیک کاموں کو ریا و نمود سے پاک رکھنے، عارضی اور حقیر مادی مفادات کے مقابلہ میں دائمی اور بڑے روحانی مقاصد کو اختیار کرنے کی ترغیب دینے میں بے اثر اور ناکام تھا۔

عربوں کی عظیم اکثریت کا دین دین ابراہیمی تھا۔ اس دین کے بنیادی تصورات، عقائد، عبادات و شعائر، مراسم و روایات بالکلیہ مٹ نہیں گئے تھے۔ ایک خدائے بزرگ، خالق و رب، علیم و قدیر کا تصور ان میں موجود تھا۔ آخرت، حشر و نشر، اور مجازات اعمال سے وہ ناآشنا نہیں کہے جا سکتے۔ انبیاء سابقین کے نام ان کے حافظے میں محفوظ تھے۔ ان کی امتوں کی عبرتناک داستانیں ان کی روایات کا جزء بن چکی تھیں۔ شریعت ابراہیمی کے مختلف ضابطے جو نکاح و طلاق، عدت، دیت، حج و قربانی، غسل و طہارت سے متعلق تھے ان پر کسی نہ کسی صورت میں عمل ہوتا تھا۔[2] لیکن ان سب کے باوجود ان کا دین بے جان ہو کر رہ گیا تھا۔

پہلی چیز جس نے ان کے عقائد کو بے جان بنا دیا تھا وہ شرک ہے۔ خدائی میں انہوں نے خدا کے ساتھ فرشتوں، جنوں، سورج، چاند، ستاروں، آگ اور دوسری طبعی قوتوں کو شریک کر لیا تھا

---

[1] المرأة فی الشعر الجاہلی، ۱۹۸ - ۱۹۹ [2] کتاب العرب لابن قتیبہ، ۲۹۰ - ۲۹۱۔

اس شرک کا پہلا نتیجہ یہ تھا کہ خدائے واحد سے عربوں کی دینی زندگی کا رشتہ کٹ گیا تھا۔ وہ صرف آسمانوں کا خدا رہ گیا تھا، زمین کے سارے امور اور انسان کے تمام معاملات سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہ گیا تھا۔ زمین کی ربوبیت، سیکڑوں شریکوں میں بٹ گئی تھی اور یہی شرکا، دینی جذبات اور اعمال کے مراکز بن گئے تھے۔ حمد و ثنا ان کی ہوتی، عزت و جلال کی تکبیریں ان کی بلند ہوتیں، قربانیاں اور نذریں ان کے استھانوں پر پیش ہوتیں، دعائیں اور عبادتیں ان کی ہوتیں فصلوں میں حصہ ان کے لیے نکالا جاتا، اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکریاں ان کے نام پر چھوڑی جاتیں، وعدوں پر ان کو شاہد بنایا جاتا تھا قول پر قسمیں ان کی کھائی جاتیں، عبادت خانے اور ہیاکل ان کے نام کے ہوتے۔ کاہنوں اور پروہتوں مجاوروں کا پورا گروہ ان کی خدمت پر مامور تھا جن کی کفالت کے لیے جائدادیں وقف کی جاتیں۔ ان کے توسط سے مہمات پر اجازت طلب کی جاتی، خیر و برکت کی درخواست کی جاتی لڑائیوں اور جنگوں میں ان سے کامیابی کی دعا کی جاتی، سفر میں یا لڑائی میں ان کے بتوں کو گھروں اور آستینوں میں رکھا جاتا، فوجوں اور قافلوں میں ان کی یادگاریں فتح و کامرانی کے لیے ساتھ رکھی جاتیں۔

خدائے واحد سے جب عربوں کا رشتہ ٹوٹا اور جھوٹے خداؤں سے جڑا تو ان کی زندگی ایک طرف بلند تصور اور پاکیزہ نصب العین سے محروم ہوئی ان کی نگاہوں سے خیر و کمال کی وہ خدائی صفات اوجھل ہوگئیں جو انسان کی اصلاح و تکمیل ذات کی محرک بنتی ہیں۔ ان کے ذہنوں عدل و انصاف، علم و آگہی ، وہ الٰہی صفات، دور ہوگئیں جن کے تصور سے انسان برائیوں سے باز رہتا ہے۔ خدا کی قدرت، حکمت و ربوبیت پر سے بھی ان کا یقین اٹھ گیا جن سے توکل، صبر اور شکر جیسی صفات انسان میں پیدا ہوتی ہیں ، اخلاق تکمیل کے لیے ناگزیر ہیں۔

دوسری طرف ان کا تعلق جن خداؤں سے جڑا وہ قوت کے مالک تو یقیناً سمجھے جاتے تھے لیکن خیر و شر میں امتیاز، جائز اور ناجائز کے فرق، اور کمال کی تمام صفات سے خالی تھے۔ وہ نہ نیکیوں پر ترغیب دے سکتے تھے اور نہ برائیوں سے روک سکتے تھے۔ وہ بندوں کے مطاع اور حکمراں نہیں انسان کے محکوم اور ان کی خواہشات کی تکمیل کے لیے آلہ کار تھے۔ اسی صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان معبودوں

کی عزت و وقعت عربوں کی نظر میں گر گئی، ان کی عبادتیں اور مراسم کھیل و تماشہ بن گئے مشہور واقعہ ہے کہ امرء القیس اپنے باپ کے خون کا انتقام لینے کے لیے بنی اسد پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ راستہ میں ذی الخلصہ سے گزرا جو تبار رکابت تھا۔ سارا عرب اس کی عزت کرتا تھا اس کے ہاتھ میں امر و نہی اور انتظار کے تین تیر تھے۔ امرء القیس اس سے حملہ کی اجازت اور کامیابی کا وعدہ چاہتا تھا۔ اس نے تین بار تیر نکلوائے لیکن ہر بار ممانعت کا تیر نکلتا تھا، بالآخر اسے بت پر غصہ آگیا، اور تیر اٹھا کر بت کے منہ پر کئی ضربیں لگائیں اور آخر میں تیر توڑ کر پھینک دیا۔ اور بت کو مخاطب کر کے کہا۔ اگر تیرا باپ کبھی قتل ہوا ہوتا تو تو ہرگز مجھ کو نہ روکتا۔ پھر بنی اسد پر حملہ کیا اور ان کو شکست دی، اور جی بھر کر ان سے انتقام لیا۔ اس کے بعد کبھی کسی معاملہ میں کسی بت سے اجازت طلب نہیں کی[1] بتوں کے ساتھ عربوں کی وفاداری ایسی رہ گئی تھی کہ اگر لڑائی میں ہار جاتے تو اپنے بتوں کو اٹھا کر پھینک دیتے اور فاتح قوم کے بتوں کو پوجنے لگتے۔

شرک کا دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عقائد کی جگہ توہمات اور خرافات لے لیتے ہیں۔ اوہام پرستی دین و عقیدہ بن جاتی ہیں۔ عربوں میں بھی ایسا ہی ہوا۔ ان کے مختلف توہمات کا بیان مقصود نہیں ہے صرف ان توہمات کا تذکرہ کیا جائے گا جن کی وجہ سے ان میں مختلف برائیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ ان کا معمول تھا کہ جب کوئی بڑا آدمی مرجاتا تو اس کی قبر پر اونٹنی باندھ دیتے اور اس کو بھوکا پیاسا رکھتے حتیٰ کہ وہ چیختے چیختے مرجاتی۔ اس وحشیانہ فعل کا جواز ان کے ہاں یہ خیال تھا کہ اونٹنی آخرت میں میت کی سواری کے کام آئے گی[2] جب کسی شخص کے اونٹوں کی تعداد ہزار تک پہنچ جاتی تو ایک اونٹ کی آنکھیں پھوڑ دیتے تاکہ دوسرے اونٹ نظر بد کے اثر سے محفوظ ہو جائیں[3] جب کبھی قحط پڑتا تو گائے کی دم میں گھاس پھوس باندھ کر آگ لگا دیتے اور سمجھتے کہ اس عمل سے پانی برسے گا[4] سفر پر جاتے تو کسی درخت پر ڈورہ باندھ کر گرہ لگا دیتے۔ واپسی پر اگر گرہ کھلی ملتی

---

[1] کتاب الاصنام للکلبی تحقیق احمد زکی پاشا، قاہرہ ۱۹۱۴ء صفحہ ۴۷ [2] بلوغ الارب ۲: ۳۰۷

[3] بلوغ الارب ۲: ۳۰۶ [4] بلوغ الارب ۲: ۳۰۱

توسمجھتے کہ بیوی نے بدکاری کی ہے[1] سفر میں راستہ بھول جاتے تو کپڑے الٹ کر پہن لیتے[2] کعبہ کا ننگے طواف کرتے، ان کا خیال تھا کہ خدا کے پاک گھر کا طواف گناہوں سے آلود کپڑوں میں جائز نہیں ہے۔ معبودوں کو خوش کرنے کے لیے انسان کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ آنحضرت کے جدِّ امجد عبد المطلب نے منت مانی تھی کہ اپنے بیٹے کی قربانی کریں گے۔ جذبۂ شجاعت کی تقویت کے لیے شیر اور درندوں کا گوشت کھاتے تھے[3] بلاؤں سے نجات کے لیے غلاظت لگاتے تھے[4] عام خیال تھا کہ مقتول کا جب تک انتقام نہیں لیا جاتا اس وقت تک اس کی روح ایک طائر کی شکل میں اس کی قبر پر "اسقونی اسقونی" (مجھے پلاؤ میری پیاس بجھاؤ) کی صدا لگاتی رہتی ہے[5]

شرک کے علاوہ جس دوسری وجہ سے عربوں کا دین ان کے اخلاق کو متاثر کرنے کے قابل نہیں رہ گیا تھا وہ آخرت کی زندگی، حشر ونشر اور مجازات اعمال میں ان کا شک وریب تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سڑی گلی ہڈیوں میں کس طرح دوبارہ زندگی پیدا ہوگی جسم کے اجزا جب خاک میں مل کر خاک ہو جائیں گے تو کس طرح ان سے ایک نیا قالب تیار کیا جائے گا، پھر کس طرح اس میں روح ثانی جائے گی۔ یہ اعتراضات وہ محض اعتراض کی خاطر نہیں کرتے تھے، ان کا بڑا گروہ واقعتاً اس ۔۔۔ میں مبتلا تھا۔ ایک گروہ تو سرے سے آخرت کا منکر ہی تھا[6] جن لوگوں کو آخرت پر یقین تھا ان کا یقین بھی مجمل اور غیر واضح تھا۔ قریش کے وہ افراد جو اپنی سلیم الفطرتی کے باعث شرک سے بیزار اور آخرت کے قائل تھے، حرم میں کھڑے ہو کر خدا سے دعا کرتے تھے کہ خدایا ہم میں ایسا رسول بھیج جو ہمیں آخرت کی زندگی کی تفصیلات سے آگاہ کرے۔ جب تک آخرت کا تصور ایک احتمال اور ایک ظن کی حیثیت میں ہوتا ہے اور مفصل اور پختہ عقیدہ نہیں ہوتا اس وقت تک زندگی اور اخلاق متاثر نہیں کر پاتا۔

جو لوگ آخرت پر عقیدہ رکھتے تھے ان کا عقیدہ ایک اور سبب سے مفلوج ہو کر رہ گیا تھا

---

[1] بلوغ الارب ۲: ۲۴۴-۳۱۷ [2] بلوغ الارب ۲: ۳۰۶ [3] بلوغ الارب ۲: ۳۲۳-
[4] بلوغ الارب ۲: ۲۱۹ [5] بلوغ الارب ۲: ۳۱۱ [6] بلوغ الارب ۲: ۲۲۰-

ان میں شفاعت کا تصور عام تھا۔ فرشتوں کو وہ خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، ان کو اور دوسرے معبودوں کو پوجنے کے لیے ان کے پاس وجہ جواز یہ تھی کہ خدا کے حضور ان کے معبود ان کی سفارش کریں گے[1] ان کی خطاؤں اور گناہوں کو بخشوا دیں گے قریش کعبہ کا جب طواف کرتے تو پڑھتے جاتے تھے کہ

والات والعزی ومناۃ الثالثۃ الاخری لات، عزیٰ اور تیسرا مناۃ۔ یہ بڑے برگزیدہ ہیں اور

فانھن الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترتجی[2] ان کی سفارش کی خدا کے ہاں امید ہے۔

شفاعت کا یہ جاہلی نظریہ گناہوں پر جری بناتا تھا۔ جرائم پر مداومت سکھاتا اور برائیوں پر گرفت اور سزا سے بے خوف اور مامون بناتا تھا۔ یہ نظریہ شرک کی پیداوار تھا اور اس سے چمٹے رہنے میں معاون بھی۔

شریعت ابراہیمی میں دین کی حقیقی روح بیدار کرنے، خدا سے تعلق جوڑنے، تقویٰ اور صلاح بیدا کرنے کے لیے جو عبادتیں رکھی گئی تھیں عربوں نے ان میں طرح طرح کے تصرفات کر کے انھیں کھیل تماشا بنا دیا تھا۔ نماز کے بارے میں قرآن مجید کا بیان ہے: وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً[3] حرم میں ان کی نماز تالی پیٹنا اور سیٹی بجانا رہ گئی تھی۔ حج سے فارغ ہو کر منیٰ پر جلسہ کرتے اور خدا کی یاد کے بجائے اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں کو فخر کے ساتھ بیان کرتے اور بڑائی کی ڈینگیں مارتے[4] جنازہ کی دعا اس طرح ہوتی: میت کا ولی جنازے کے پاس کھڑا ہو کر مرنے والے کے محاسن بیان کرتا، اس کی تعریفیں کرتا، پھر میت کو قبر میں دفن کر دیتے اور علیک رحمۃ اللہ پڑھ کر چلے آتے تھے۔ سال کے چار مہینوں کو محرم قرار دیا جاتا۔ ان میں لڑائی جنگ اور قتل خون ممنوع تھا۔ لیکن ان مہینوں میں بھی عرب جنگ و جدال سے باز نہیں رہتے تھے۔ اور خانہ پری کے طور پر دوسرے مہینوں کو حرام ٹھہرا لیتے تھے[5]۔ قریش نے اس تصرف کو وجہ افتخار بنا لیا تھا

---

[1] کتاب الاصنام للکلبی: ۱۹ [2] سورۃ الانفال: ۳۵ [3] سورۃ البقرۃ: ۲۰۰ [4] بلوغ الارب ۸۰۱۲

[5] اس فعل کو نسی کہتے ہیں تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو بلوغ الارب ۳: ۷۰-۷۶ [6] قریش نے عام عربوں سے اپنے کو ممتاز کرنے اور اپنی دینی سیادت جتانے کے لیے دوسری بدعتیں ایجاد کی تھیں مثلاً عام لوگوں کے برعکس عرفات میں قیام نہیں کرتے تھے اسی بنا پر انہیں حمس کہا جاتا تھا۔ حج میں وہ اپنے لیے سرخ چمڑے کے خیمے نصب کرتے تھے مگر دوسرے قبائل کو اجازت نہ تھی۔ بلوغ الارب ۲-۲۸۹-۲۹۰۔

شریعت ابراہیمی کے ارکان کو اس طرح منہدم کرکے عرب پروہتوں پجاریوں اور کاہنوں نے جو شریعت اس کی جگہ پر بنائی تھی اس کا حاصل بتوں کو حق وناحق میں یاد کرنے، مدد مانگنے، استھانوں پر قربانیاں چڑھانے، نذرانے پیش کرنے، قسمتیں معلوم کرنے، فال نکالنے، نحس اور سعد کی پابندی کرنے، جنوں اور ارواح خبیثہ کی پناہ چاہنے، ٹونے اور ٹوٹکے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا[1]

مشرکین کے مقابلہ میں یہود دینی اعتبار سے بہتر ہو سکتے تھے ان کے پاس خدا کی کتاب تھی۔ ان میں علماء اور احبار تھے جو تورات سے واقف، توحید و آخرت پر یقین رکھنے والے اور موسوی شریعت کے امین و وارث تھے لیکن عملاً ان کی حالت مشرکین سے بہتر نہ تھی، ان کی اکثریت نماز کی تارک تھی۔ ان میں جماعت سے نماز کا نظام ختم ہو چکا تھا، وہ روزے چھوڑ چکے تھے، زکوٰۃ کے بجائے سود کھانے لگے تھے[2] سودی کاروبار پر ان کی اجارہ داری قائم تھی۔ ان کا ایک گروہ آخرت کا منکر تھا[3] خدا کے محبوب بندے ہونے کا جھوٹا خیال ان میں عام تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ دوزخ کی آگ اول تو انہیں لگے گی نہیں اور اگر لگی بھی تو چند روز کے اندر ہی اس سے نجات مل جائے گی۔ آخرت کی فلاح ان کے خیال میں ایمان و عمل کے بجائے گروہی تعلق پر مبنی تھی جو یہودی ہو اس کے لیے نجات یقینی ہے خواہ اس کے اعمال جیسے بھی کچھ ہوں۔ جنت کی نعمتیں انھیں کے لیے مخصوص تھیں[4]

یہودی علماء دین کی اشاعت و تبلیغ سے غافل تھے۔ امر بالمعروف بھول بیٹھے تھے۔ اس کے بجائے عوام میں مقبولیت اور حقیر مادی منافع کی خاطر انہوں نے خدا کی کتاب اور شریعت میں تحریف شروع کر دی تھی۔ عوام کی خواہش کے مطابق تاویلیں کرنے لگے تھے بعض احکامات پر پردہ ڈال دیا تھا قطع ید اور دوسرے حدود معطل کر دئے تھے اور ان کی جگہ پر من گھڑت قوانین وضع کر لیے تھے۔ دنیا کی محبت ان میں کوٹ کوٹ کر بھر گئی تھی بخل، رشوت، سود خوری سونا اور چاندی جمع کر کے رکھنا

---

[1] بلوغ الارب ۳: ۹۹۔ ۲۰۷، ۲۱۵، ۳۴۰ استقسام بالازلام کی تفصیلات کے ملاحظہ ہو المیسر والازلام لعبدالسلام محمد ہارون، ۱۹۵۳ء۔ [2] سورہ بقرہ: ۴۲۔ [3] صدوقی خدا کے منکر تھے۔
[4] سورہ بقرہ ۹۴، ۱۱۱۔